ڈاکٹر محمد کامران کی تخلیقی جہات

Creative Dimensions of Dr. Muhammad Kamran

ڈاکٹر محمد امجد عابد

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور

ڈاکٹر عبد الرحیم

اسسٹنٹ پروفیسر اردو، اسلامیہ گریجوایٹ کالج سول لائنز، لاہور

Abstract

A literary writer and critic with broad vision and multi dimensional insight reflects diversity of thoughts with individual style for inspiration of global society with a clarity of theme and theory is Dr.Muhammad kamran whose talent of critical thinking has been acknowledged through creation of Angaray , where food for thought and brainstorming is ready to agitate against system of exploitation. Determination and destiny are change agents on chess table of life. Undeniable social rules and acknowledged social realities have been pen pricked by the writer to challenge system of monopoly and authority. Reflection of phenomenology with originality of thought is one of the distinguished attributes in all his work clearly evident by his contemporaries .This article is an effort to explore the literary and criticism potential of Dr. Muhammad kamran. Bearance, commitment and survival are forces strongly correlated with struggle as per considered view point of Dr. Muhammad kamran. Author of the article has social interaction with under discussion personality and his contribution in literature.

کلیدی الفاظ: تخلیقی، سماجی، سیاسی، نفسیاتی، عالمگیریت، انگارے، خود کلامی، آن لائن تنقید، اخلاقی اقدار، عصرِ حاضر

تخلیق ایک ایسا عمل ہے جس سے نہ صرف نادیدہ جہانوں کی وسعتوں کو سر کیا جا سکتا ہے بل کہ اس کی بہ دولت نئے امکانات کے در بھی وا کیے جا سکتے ہیں۔ کبھی اس کے ذریعے ایسی دُنیا کی سیر کی جا سکتی ہے جو یکسر نئی اور انوکھی ہو سکتی ہے جس کا ادراک سائنس اور سماجی علوم کو بہت بعد میں ہوتا ہے۔ تخلیقی عمل اپنی جلوہ گری کے لیے کبھی ماضی کی دنیا میں غوطہ لگا کر دُر نایاب تلاش کرتا ہے اور کبھی قطرے میں دجلہ کا کھوج لگاتا ہے۔ کبھی وہ مُستقبل کی پنہائیوں میں محوِ پرواز ہو کر ایسے ایسے آئینہ خانوں کا پتہ دیتا ہے جو قارئین کو جہاں ورطۂ حیرت میں ڈالنے کا باعث ہوتا ہے وہاں انھیں زمانۂ استقبال کی تیاری کرنے کے قابل بھی بناتا ہے۔ کبھی کبھی تخلیقی عمل اپنے اظہار کے لیے حال کے سٹیج کا انتخاب کرتا ہے جس میں زمانے کے سماجی، سیاسی، نفسیاتی اور گلوبلائزیشن کے نتیجے میں صارفیت، خود غرضی، رقابت، حسد، اخلاقی اقدار کے پائمال ہونے جیسے مسائل کو موضوع بنا کر عصر حاضر کے لمس سے اپنی تخلیقات کو وقت کی لوح پر ان مٹ نقوش مرتسم کرنے کے قابل بنا دیتا ہے۔ تخلیقی عمل کے ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا کا کہنا ہے کہ:

> "تخلیقی عمل کی وضاحت کے معاملے میں ہر تخلیق کار نے شخصی تجربے کی بنا پر اپنا ایک نظریہ تو پیش کیا ہے لیکن جہاں ایک ہی نظریے کے متعدد علم بردار پیدا ہوئے ہیں وہاں اس کے گرد ایک مکتب فکر از خود ہی مرتب ہو گیا ہے۔ مثلاً جب کوئی تخلیق کار کہتا ہے کہ تخلیقی عمل کے دوران اُس کی باگ ڈور کسی روحانی ہستی کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے؛ یا کوئی کہتا ہے کہ اس کے اندر کوئی جن ہے جو تخلیقی عمل کے دوران میں اس پر قابض ہو جاتا ہے؛ یا کوئی ملکوتی نغمہ یا آہنگ اسے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے؛ تو فکری سطح پر یہ تمام تجربات اس بات پر منتج ہوتے ہیں کہ تخلیق کاری میں اہم ترین کردار اُس عظیم ہستی کا ہے جو مظاہر کے عقب میں موجود ہے اور جو تخلیق کار کو اپنے اظہار کے لیے آلۂ کار بناتی ہے۔ اس نظریے کے مطابق تخلیق کاری کا عمل کشف والہام کا عمل ہے اور شاعر کی حیثیت تلمیذ الرحمٰن کی ہے۔"[1]

تخلیق کی اسی وجدانی کیفیت کے لحاظ سے غالبؔ نے کہا تھا کہ:

؎ آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے[2]

ڈاکٹر محمد کامران پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کے ادارہ زبان و ادبیات اردو کے ڈائریکٹر ہیں۔ وہ جہاں اپنی ہنس مکھ شخصیت کی بہ دولت طلباء میں مقبول ہیں وہاں یونیورسٹی اساتذہ میں بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ وہ نہ صرف طلباء کی تعلم و تربیت اور حوصلہ افزائی کا فریضہ سر انجام دیتے ہیں بل کہ

محنتی اور ذہین طلباء بھی ان کے لیے نیک خواہشات اور تمناؤں کا اظہار کرتے ہیں۔ جہاں تک ان کے تخلیقی اثاثے اور جہت کا تعلق ہے ان کا ادبی ورثہ تحقیق، تنقید، سفر نامہ، تاریخ اور تراجم تک پھیلا ہوا ہے۔

اسی تحقیقی و تنقیدی و سرمائے کی ابتدائی کڑی ان کی پہلی کتاب "انگارے" ہے جو ۲۰۰۵ء میں ماورا پبلشرز لاہور سے چھپ کر علمی و ادبی حلقوں میں متعارف ہوئی۔ اسی کتاب کے چار ابواب ہیں۔ پہلا باب افسانوی مجموعے "انگارے" کے تاریخی پس منظر سے متعلق ہے۔ جس میں مصنف نے عرق ریزی سے اس کے سبھی حقائق کو نہ صرف واضح بل کہ ان کے نتائج اُس ماحول اور اس کے پس منظر علمی و سماجی حلقوں میں اُس کے ردِ عمل کو اجاگر کر دیا ہے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں کہ:

> "انگارے کی اشاعت ملک بھر میں ہنگامہ آرائی اور عوامی غم غصہ کا سبب بنی۔ اُردو کے بیشتر اخبارات کے علاوہ بعض رسائل نے بھی انگارے کے خلاف قلمی جہاد کا آغاز کر کے اس کی ضبطی کا مطالبہ کر دیا ہے۔"[۳]

مصنف نے بہت سے چشم کشا حقائق انگارے اور اس کے مصنفین کے باب میں بیان کر کے جہاں اس افسانوی مجموعے کی اہمیت نمایاں کی ہے وہاں اس کے مصنفین کی علمی و ادبی حیثیت کو بھی مسلم کر دیا ہے۔ باب دوم انگارے کے مصنفین کے سوانحی حالات، شخصیت اور تصانیف کی خصوصیات کے بیان کے لیے مختص ہے۔ بیس صفحات کے باب میں ان افراد کی شخصی زندگی، تعلیم اور حالات و واقعات کو بیان کر کے نہ صرف ان اقدار کی چاپ کو محسوس کیا جا سکتا ہے جس نے بیسویں صدی کے دروازے پر دستک دے کر پرانی اقدار کے خاتمے کا اعلان کر دیا تھا۔ آج جب کہ ہم ۲۰۲۳ء میں قارئین سے ہم کلام ہو رہے ہیں اب ان پرانی اقدار کے دعوے دار کہاں ہیں اور اس کے برعکس نئی اقدار کے حامی ہر جگہ اور ہر حلقوں میں موجود دکھائی دیتے ہیں۔ باب سوم "انگارے" میں شامل افسانوں کا فکری و فنی جائزہ پیش کرتا ہے کہ اس کی آمد نے پرانی اقدار کے خاتمے اور نئی اقدار کو اپنانے کی ایک سعی کا کام سرانجام دیا ہے جسے پرانی اقدار کے علم بردار طبقے نے جہاں مخالفت سے اس پر اپنی تنقید کی راہیں کھولیں وہاں اپنی کوششوں سے اس میں شامل مصنفین کو جان سے مارنے کی دھمکیاں بھی دیں۔ انھیں مذہب بے زار اور لادین بھی قرار دے کر مذہب کے دائرہ سے خارج کرنے کا اعلان بھی کیا۔ مذہبی مناظرے سے دل چسپی رکھنے والے افراد اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ دلیل کے متبادل دلیل، حقائق کے مقابلے میں حقائق اور معاشرتی و سیاسی رجحانات کے بدلے میں سماجی و سیاسی رجحانات کو بیان کر کے حزبِ مخالف کو لاجواب و مطمئن کیا جاتا ہے لیکن یہاں محض اس پر لفظی گولہ باری کرنے والوں نے

دلیل، حقائق اور رجحانات پر بات کرنے کے علاوہ سب حربے اختیار کیے لیکن ان افراد کے نظریے کو غیر جانب دارانہ انداز میں سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر محمد کامران کا موقف ہے کہ:

> "اگر انگارے میں شامل افسانوں کو ان کے مخصوص دور کے تناظر میں رکھتے ہوئے ان کا فکری و فنی تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انگارے گروپ، نے اپنی سطح پر ہلچل پیدا کر کے معاشرتی جمود کے سحر کو توڑنے کی کوشش کی اور اردو افسانہ کو حقیقت نگاری کے ایک نئے انداز سے روشناس کرنے کے ساتھ فنی بے باکی کی ایسی زریں مثال قائم کی جس نے اردو افسانے کو ایک نئی جہت عطا کی اور افسانوی ادب کا پورا منظر نامہ تبدیل کر کے رکھ دیا۔ اسی لیے اگر ادب کا تعلق ارضی حقائق سے ہے اور زندگی کی تبدیلیوں کا فہم حاصل کر کے معاشرہ کو مستقبل کے حالات و واقعات کے لیے تیار کرنا شعور کی دلیل ہے تو 'انگارے' میں سماجی مسائل کا حل محسوس کیا جا سکتا ہے۔"[۴]

اس کتاب کا باب چہارم اردو افسانے پر "انگارے" کے اثرات سے متعلق ہے۔ جیسا کے اس سے پہلے یہ بات موضوع بحث بن چکی ہے کہ علم الکلام میں دلیل کو اس سے بہتر دلیل لا کر رد کیا جا سکتا ہے چوں کہ پرانی اقدار کے حامل افراد نے بدلتے دور کے تقاضوں کے پیش نظر ان تبدیلیوں کو نہ صرف محسوس کرنے سے ہاتھ کھینچ لیا بل کہ مخالفت برائے مخالفت کی فضا ہموار کی۔ انھوں نے علمی مسائل کو علمی سطح پر حل نہیں کیا۔ اسی لیے جدید اقدار کے حامل افراد نے محض شور و غل سے اجتناب کرتے ہوئے "انگارے" میں شامل افسانوں کو نہ صرف پڑھا بل کہ سر دُھنا اور اس کے ساتھ ساتھ تخلیق کاروں نے اس سے اثرات بھی قبول کیے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر محمد کامران لکھتے ہیں کہ:

> "کسی بھی تحریک کے اثرات یا فنی زاویوں کا تجزیہ کرنے کے لیے اس کے غالب رجحانات کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ یہ رجحانات بلاواسطہ ہوں یا بالواسطہ، روایت کی خوشبو کے ساتھ مل کر فن کے قالب میں سما جاتے ہیں اور فکر و نظر کو نئی وسعتوں سے ہمکنار کرتے ہیں۔۔۔'انگارے' کی اشاعت سے پہلے اگرچہ سجاد ظہیر، احمد علی اور محمود الظفر مغربی ادبیات اور مارکس کی انقلابی فکر سے شناسائی حاصل کر چکے تھے مگر مجموعی طور پر یہ ان کا سماجی شعور اور داخلی کرب تھا جس کے زیرِ اثر انھوں نے غربت، بھوک، بیماری اور استحصالی نظام کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا تھا۔"[۵]

"انگارے" کی اشاعت نے جہاں معاشی و سماجی سطح پر مقبولیت حاصل کی وہاں دور جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگی اختیار کرتے ہوئے نسل نو نے نہ صرف اسے قبول کیا بل کہ اس کو فروغ دیتے ہوئے ترقی پسند تحریک کی بنیاد رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کی راہیں بھی ہموار کی۔ اس سے وہ دور ہوا ہونے لگا کہ جس کے تحت

ایک با اثر پس ماندہ اور مفلس کا استحصال کرنے کا سوچ سکے۔ لہٰذا اس پر بھی غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے کہ جدید اقتدار نے دقیانوسی اقدار کے خلاف طبل جنگ بجایا اور جاگیر داری نظام کو اپنی بنیادیں متزلزل ہوتی محسوس ہوئیں۔ ہندوستان میں تو جاگیر داری اور سرمایہ داری نظام کو ایک حد تک دیس نکالا مل گیا لیکن پاکستان میں اس کے خاطر خواہ اثرات دیکھنے میں نہیں آئے۔ بقول رفیق سندیلوی:

نابینا جنم لیتی ہے اولاد بھی اس کی
جو نسل دیا کرتی ہے تاوان میں آنکھیں [۶]

اردو نثر کو ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے ابتداء سے موجودہ دور تک کن تبدیلیوں اور مراحل سے پاؤں پاؤں چل کر، لڑکھڑاتے ہوئے با اعتماد قدم اٹھاتے اور ترقی کی شاہ راہ پر گام زن ہو کر کن کن سنگ میل کو عبور کرنا پڑتا ہے۔ اس کا مختصر مگر جامع بیان ڈاکٹر محمد کامران کی دوسری کتاب "میرا من سے انتظار حسین تک" میں ملتا ہے۔ مونولوگ (Monologue) خود کلامی یا ہم کلامی کو کہا جاتا ہے اور اس میں متکلم اور سامع ایک ہی شخص ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں متکلم، سامع ہوتا ہے اور سامع ہی متکلم ہوتا ہے۔ عمومی حالات میں ایسا ہونا مشکل ہے لیکن خصوصی صورتِ حالات میں ایک شخص کو جب خود اپنے آپ سے مکالمہ کرنا پڑتا ہے تو اسے دوسرے لوگوں کی طرح باتوں کو سمجھانے کے لیے فصاحت کے اصولوں کو مد نظر رکھنا نہیں پڑتا ہے کیوں کہ انسان کو خود کئی باتوں کا علم ہوتا ہے۔ اس لیے وہ خود کلامی مختصر نویسی (Shorthand) کی علامات کی جیسی ہوتی ہے جو اس کو سمجھتا ہے وہ اس سے لطف اندوز ہوتا ہے اور جب کہ جو نہیں سمجھتا وہ اس سے بے زاری کا اظہار کرتا ہے۔ اس کتاب کے دیباچے کو ڈاکٹر محمد کامران نے مونولوگ قرار دیا ہے لیکن اس کی خوبی یہ ہے کہ اس میں انھوں نے بڑی خوب صورتی اور منفرد انداز سے اردو نثر کے ارتقائی مراحل کو بیان کیا ہے۔ یہ بیان مدلّل ہونے کے ساتھ ساتھ پُر اثر بھی ہے۔ اگر مونولوگ ایسا ہوتا ہے تو یہ نہ صرف فصیح ہے بل کہ بلاغت کے سبھی پہلوؤں کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ میری اس سے پہلی گفت گو کو آپ مبالغہ رائی پر محمول نہ کریں اس لیے دیباچے سے ایک اقتباس پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

> "روئے زمین پر انسان کی کہانی تحیر و تلاش اور تشنگی کی کہانی ہے۔ کسی برتر قوت کی تلاش ہو یا خود آگاہی کا سفر، تشنگی نے ایک ایندھن کا کام دیا۔ اسی ایندھن کی بدولت انسان کبھی زمین کی گہرائیاں ماپتا ہے، کبھی سمندروں میں شناوری کرتا پھرتا ہے اور کبھی خلا کی خاموشی میں بولتے

اسرار کو سننے کی کوشش کرتا ہے۔ جس مقام پر عقل کے پر جلنے لگتے ہیں وہاں سے عشق کا تازہ دم بُراق اپنا سفر شروع کرتا ہے۔ علم کا سرچشمہ ایک ہے۔ دنیا کے سارے علوم اسی سرچشمے سے پھوٹتے ہیں جس طرح سینۂ سنگ سے پھوٹنے والا شفاف چشمہ جھاگ اڑاتا، پتھروں سے سر پھوڑتا کبھی سرشور دریا کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور کبھی میدانی علاقوں میں کسی سادھو کی طرح شانت ہو کر نروان بکھیرتا سمندر سے واصل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح علم کے آفاقی دائرے کے اندر بہت سے چھوٹے بڑے پھیلتے سکڑتے دائرے بھی پیغام کی ترسیل کرتے ہیں کہ ہر دائرے کا نقطہ آغاز ہی اس کا نقطہ انجام ہوتا ہے وہ نقطہ آغاز جب دائرہ مکمل کر کے خود اپنے آپ کو چومتا ہے تو انسان کو اپنے ہونے کا اثبات ملتا ہے۔ فرشتے انسان پر رشک کرتے ہیں۔ ادب بھی ایک دائرہ ہے اس کے اندر موجود چھوٹے چھوٹے دائرے اجرام فلکی کی طرح ایک دوسرے سے جدا ہونے کے باوجود ایک دائمی آفاقی کشش کے سحر میں مبتلا ہیں۔"[7]

اس کتاب کو انھوں نے داستان، ناول، ڈرامہ اور افسانہ کے عناوین کے تحت ترتیب دیا ہے۔ داستان کے ضمن میں انھوں نے باغ و بہار اور افسانہ عجائب پر سیر حاصل بحث کر کے ان کے فکری و فنی محاسن کو انتہائی چابک دستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ناول کے باب میں انھوں نے "ابن الوقت، فردوس بریں، امراؤ جان ادا اور آخرِ شب کے ہم سفر" پر نہ صرف روشنی ڈالی ہے بل کہ عام قارئین کو متذکرہ بالا ناولوں کو پڑھنے کی جودت بھی جگا دی ہے۔ انھوں نے "چند مفروضات" کے تحت ڈرامے کے فنی پہلوؤں پر بات کی ہے جب کہ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے "رستم و سہراب" اور "انارکلی" کا بھی جائزہ لیا ہے۔ "افسانہ" کے ذیلی عنوان میں انھوں نے سجاد حیدر کے "خارستان و گلستان"، "پریم چند کے کفن"، سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں، محمود الظفر کے " انگارے " میں شامل افسانوں کے معائب و محاسن کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سعادت حسن منٹو کے افسانے "ٹوبہ ٹیک سنگھ"، غلام عباس کے افسانے "اوور کوٹ" اور انتظار حسین کے افسانے "آخری آدمی" کا تذکرہ بھی شامل ہے۔ اس طرح یہ کتاب اردو نثر کے چند رنگ ڈھنگ اور آہنگ سے متعارف کروانے کا باعث بھی ہے۔ اردو نثر کے ارتقا کو واضح کرنے کے لیے کئی جلدوں پر مبنی کتاب درکار ہوتی ہے لیکن ڈاکٹر محمد کامران نے اس کتاب کے ذریعے اردو نثر کا جائزہ پیش کیا ہے اس کو پڑھ کر اب کسی کو مزید جاننے کا شوق پیدا ہو جائے تو اس کے لیے اردو نثر سے متعلق جامع کتب کا جائزہ لے کر ذوق و شوق کو تسکین دی جا سکتی ہے۔

"گ سے گڑیا، ج سے جاپانی" ڈاکٹر محمد کامران کا سفر نامہ ہے جو ماورا سے ۲۰۱۰ء میں چھپ کر ادبی کہکشاں میں اپنی نقرئی کرنیں بکھیر رہا ہے۔ اس کا انتخاب چھ افراد کے نام ہے۔ جن میں ڈاکٹر تاکاشی شنواد، سویا مانے، ڈاکٹر خلیل طوقار، ناصر ناکاگاوا، خالد شریف اور ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ صائمہ کامران شامل ہیں۔ کچھ افراد

باطنی آنکھ کی بیداری کے لیے مختلف طریقہ ہائے کار اپناتے ہیں۔ کچھ مراقبہ اختیار کرتے ہیں جب کچھ موسیقی سنتے ہیں اور کچھ سفر کو آزماتے ہیں۔ سب کا مقصد و مطمع نظر روحانی یا باطنی یا بصیرت کی بیداری ہوتا ہے۔ اس کتاب کے پیش لفظ "کہا جاپان کو جائیں" میں ڈاکٹر صاحب نے اس سفر کو تلاشِ ذات کے سفر سے تعبیر کیا ہے۔ جس نے ان کے تخلیقی بنجر پن کا کافی حد تک مداوا کر دیا ہے۔ وہ اس ضمن میں بیان کرتے ہیں کہ:

"سفر خارج سے داخل کا ہو یا مجاز سے حقیقت کا۔ انسان کے روحانی بنجر پن کو دُور کرتا ہے اور اس پر تخلیقی آگہی کے طلسمی در کھول دیتا ہے۔ سفر شوق کا ہو اور چشم وا ہو تو دہر آئینہ خانے کا روپ دھار لیتا ہے اور سنگلاخ دیواروں میں صدیوں سے خوابیدہ نقش ہائے رنگ رنگ انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتے ہیں۔۔۔۔ زندگی کے بے رنگ کینوس پر جاگنے والے رنگ کی ہر چھینٹ ہمیں جینے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ "گ سے گڑیا، ج سے جاپانی" میری روح کے کینوس پر اترنے والی دھنک رنگوں کی داستان ہے۔ میرے ان خوابوں کا بیان ہے جو میں نے جاگتی آنکھوں سے دیکھے۔ ان لمحوں کا گوشوارہ ہے جو میں نے دائتو بنکا یونیورسٹی جاپان کی دعوت پر جون، جولائی ۲۰۰۸ء میں جاپان میں بسر کیے۔ ۸"

یہ سفر نامہ اگرچہ ۱۶۶ صفحات پر محیط ہے لیکن ہر صفحے پر ایسے کئی مقامات سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں جہاں سے گزرتے ہوئے بہت سی باتیں انکشاف کا درجہ اختیار کر کے چونکا دینے کی صلاحیت سے مزین ہیں۔ ایسی بے ساختہ تحریروں کا انداز جہاں باتوں اور نکات سے ہوتا ہے وہاں اس کے لیے الفاظ کے چناؤ سے بھی اندازہ کرنا مشکل نہیں ہوتا۔ مزید بر آں اسلوب ایسا دل کش اور دل نشیں ہوتا ہے کہ انسان جیسے ہی اسے شروع کرتا ہے ویسے ہی واقعات کے بیان اور اسلوب کی ایسی گرفت میں آ جاتا ہے کہ انسان پر زمان و مکان کی بندشیں خود بہ خود ختم ہو جاتی ہیں اور وہ اس سفر نامے کو پڑھنے میں ایسے مگن ہو جاتا ہے کہ جیسے اسے دنیا جہان کا اور کوئی کام نہیں اور سفر نامہ پڑھ کر حظ اٹھانا ہی اس کا سب سے اہم کام ہے۔ اس سفر نامے کو منظر نگاری، واقعات کے بیان الفاظ کی بے ساختہ آمد اور اسلوب کی خوب صورتی نے وہ جادو عطا کیا ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے اور قاری کو برمودا مثلث کی نادیدہ قوتوں کی مانند اس سفر نامے کے اختتام تک پہنچا کر ہی دم لیتا ہے۔ اپنی بیان کردہ باتوں کی تصدیق کے لیے چند اقتباسات قارئین کی نذر کرتا ہوں۔

"مجھے منزل پر پہنچنے کی جلدی تھی اس لیے میں طیارے میں داخل ہونے والا پہلا مسافر تھا۔ دو سانولی، سلونی، تیکھے نینوں والی نازک اندام تھائی فضائی میزبانوں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے خوش آمدید کہا اور بورڈنگ پاس دیکھ کر مجھے میری نشست کی طرف روانہ کر دیا۔ ابھی چند ہی قدم چلا تھا کہ بائیں ہاتھ پر واقع کیبن سے ایک ایئر ہوسٹس برق رفتاری سے نکلی اور طیارے میں

داخل ہونے والے پہلے مسافر سے ٹکرا گئی۔ اگرچہ وہ خاصی دھان پان سی تھی مگر چونکہ اسے طیارے کے داخلی دروازے پر مہمانوں کو خوش آمدید کہنا تھا اور مسافر اس کے فرائض منصبی کی راہ میں حائل ہو رہا تھا اس لیے بے ساختہ ٹکر نے مسافر کے وجود کی عمارت کو لرزا کر رکھ دیا۔۔۔۔ جہاز کی سجاوٹ اور ایئر ہوسٹسوں کی لگاوٹ دیکھ کر خیال آیا کہ اگر پی۔ آئی۔ اے والے بھی اپنے کھٹارا طیاروں کو گراؤنڈ اور سال خوردہ ایئر ہوسٹسوں کو انڈر گراؤنڈ کر دیں تو یہ قومی خسارے سے نکل سکتا ہے۔"۹

ایک اور اقتباس جس سے ان کی واقعات کو بیان کرنے کی صلاحیت اور اسلوبِ نگارش ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

"پروفیسر ہیر وجی کتاؤکا، دائتو بنکا یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ انھیں دیکھ کر اُن کی عمر کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، نہ جانے کیوں مجھے ان کی شخصیت میں انسانی زندگی کے تینوں ادوار بیک وقت دکھائی دیتے ہیں۔ بچپن کی معصومیت، جوانی کا ولولہ اور بڑھاپے کی تمکنت۔ ہیر وجی کتاؤکا، جاپانی تہذیب کا نادر نمونہ ہیں۔ جوانی میں عشق کے کوچے سے گزرے، مارشل آرٹس کی تربیت حاصل کی۔ پھر نہ جانے کیسے اردو کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہوئے اور بقیہ عمر اردو کے لیے وقف کر دی۔ جاپانی ہونے کے باوجود موبائل فون اور انٹرنیٹ کے جھنجھٹ سے آزاد ہیں۔"۱۰

مشاہدہ کی باریکی اور بیانیہ کی خوب صورتی نے ایسا جادو جگایا ہے کہ پڑھنے والا نہ صرف اش اش کر اٹھتا ہے بل کہ سفر نامہ نگار کی مہارت کا بھی معترف ہو جاتا ہے۔ ایک اقتباس دیکھیے:

"جاپانی اپنے سماجی روابط میں عمل اور ردِ عمل کی دلکش مثالیں پیش کرتے ہیں۔ کسی جاپانی سے ملاقات ہو تو سلام و تعظیم کے بعد گفتگو کا آغاز ہوتا ہے۔ جہاں ایک جملے سے کام چل سکتا ہے۔ جاپانی پورا پیراگراف بولتے ہیں۔ قطع کلامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کبھی مجھے محسوس ہوتا جاپانی خوش گفتار زیادہ ہیں اور کبھی ایسا لگتا ہے کہ جاپانیوں سے بہتر سامع کوئی اور نہیں۔ کوئی گفتگو کر رہا ہو تو اتنے انہماک سے سنتے ہیں جیسے کوئی دلچسپ داستان سن رہے ہوں۔ گفتگو کے دوران باڈی لینگو یج سے بھی بھرپور کام لیتے ہیں۔ آغاز کلام میں تبسم، دوران تکلم سنجیدگی، گفتگو میں ظریفانہ رنگ در آئے تو خوب محظوظ ہوتے ہیں۔ ہنسنے کا محل ہو تو لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔ خاص طور پر نوجوانوں کو تو لگتا ہے کہ بات لیے بات گدگری ہوتی ہے اس لیے اکثر نوجوان ہنستے ہوئے

ع مڑ مڑ کے دیکھتے ہیں، کوئی دیکھتا نہ ہو۔۱۱

اس سفر نامے کے بیان کردہ محاسن کے تناظر میں کئی درجنوں اقتباسات پیش کیے جا سکتے ہیں۔ میرا قارئین کو یہ مشورہ ہے کہ وہ اس سفر نامے سے مکمل لطف اٹھانے کے لیے اس سفر نامہ سے متعلق میری چند معروضات کو تمہید سمجھ کر پڑھیں تو اس سفر نامے کے محاسن ادب میں موجود کام یاب سفر ناموں کی صف میں اسے لا کھڑا کرتے ہیں۔ اسے پڑھنے والا اس میں ایسے مگن ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے بیان کردہ واقعات قاری کے ذہن کی سلور سکرین پر حقیقی واقعات کا روپ دھار کر مجاز کو حقیقت میں منتقل کر دیتے ہیں۔ اس سفر نامے کو مکمل پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ جیسے ایک خوب صورت خواب دیکھتے ہوئے چونکے اور آنکھ کھل گئی ہو۔ پھر اُس لطف کے حصول کے لیے قاری بار بار اپنی آنکھیں بند کر کے اسے محسوس کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ناکامی پر وہ دوبارہ اس سفر نامے کی خواندگی شروع کر کے اس کی مہمات کو از سرِ نو سر کرنے کی ٹھان لیتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد کامران کی چوتھی کتاب تحقیق کی قلمرو میں آتی ہے۔ یہ ان کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے جس کا عنوان "پروفیسر احمد علی حیات اور ادبی خدمات" ہے۔ یہ کتاب اس سے پہلے اکادمی ادبیات اسلام آباد نے ۲۰۰۸ء میں شائع کی تھی۔ پھر بعد میں یہی کتاب انجمن ترقی اردو کراچی کے پلیٹ فارم سے چھپ کر قارئین تک پہنچی ہے۔ میرے پیش نظر موخر الذکر ادارے کی کتاب ہے۔ پروفیسر احمد علی انگریزی ادبیات کے استاد کی حیثیت سے بنیادی حوالہ رکھتے ہیں۔ ان کی شخصیت کا اہم اور کلیدی رخ افسانہ نگار ہونا اور اس کا شمار ترقی پسند تحریک کے بانی ارکان میں کیا جا سکتا ہے۔ ان کے افسانے لکھنو یونیورسٹی کے ادبی جریدہ "ہمایوں" کی زینت بنے۔ انگارے میں ان کے دو افسانے تھے۔ ان پر پابندی کے بعد جہاں اس کتاب اور اس میں شامل افسانہ نگاروں پر لے دے ہوئی وہاں اس کی پذیرائی میں بھی اضافہ ہوا۔ احمد علی نے افسانہ نگاری کے بعد ناول بھی لکھے۔ اس کے بعد انھوں نے قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ بھی کیا۔ اس کے علاوہ وہ دلی میں کئی سال تک بی۔ بی۔ سی (BBC) سے بھی وابستہ رہے۔

جہاں تک اس مقالے کا تعلق ہے یہ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب "احمد علی۔۔۔ سوانح اور شخصیت" کے عنوان سے ہے جس میں مقالہ نگار نے ان کی شخصیت کی تہہ در تہہ پرتوں پر روشنی ڈال کر ان کی منفرد اور دل کش زندگی کو یوں اجاگر کر دیا ہے کہ جس نے انھیں نہیں دیکھا وہ اس باب کے مطالعہ سے یہ دعوی کر سکتا ہے کہ میں پروفیسر احمد علی کو جانتا ہوں۔ وہ جتنے اچھے تخلیق کار تھے وہ اس سے بڑے انسان بھی تھے۔ باب دوم "احمد علی۔۔۔ بحیثیت افسانہ نگار" کی وضاحت کرتا ہے۔ اس میں ان کے افسانوی مجموعے "انگارے" میں شامل ان کے دو افسانوں اور اس کے علاوہ "شعلے"، ہماری گلی، قید خانہ اور موت سے پہلے کے عنوان سے افسانوی مجموعے چھپ کر ان کے مقام و مرتبہ کا تعین کر چکے ہیں جس نے ان کی زندگی میں ہی انھیں

شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ باب سوم "احمد علی۔۔۔ بحیثیت ناول نگار" میں ان کے تین انگریزی ناولOcean of Night, Twilight in Delhi اور Rates and Diplomatsپر بات کی گئی ہے۔ جہاں ان ناولوں کے فکری پہلوؤں کو زیر بحث لایا گیا ہے وہاں ان کے فنی پہلو بھی موضوع گفتگو بنے ہیں۔ انھوں نے اول الذکر کا ترجمہ "دلی کی شام" کے عنوان سے کیا لیکن مترجم کے طور پر ان کی بیوی کا نام درج کیا گیا ہے۔ باب چہارم "احمد علی بحیثیت مترجم" مدلل گفتگو سے معمور ہے۔ احمد علی جہاں انگریزی میں ناول لکھ کر اپنی صلاحیت منوا چکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنے کچھ افسانوں کا انگریزی میں ترجمہ کر کے "The Prison House کے عنوان سے منصہ شہود پر لا کر اپنے ترجمے کی صلاحیت کی بھی دھاک بیٹھا چکے تھے۔ اس مجموعے میں انھوں نے اپنے دس اردو افسانوں کو انگریزی میں ترجمہ کر کے پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے انڈو نیشین نظموں کو انگریزی کے قالب میں ڈھال کر "The Fleming Earth" کے عنوان سے ۱۹۴۹ء میں شائع کروایا۔ انھوں نے چینی شاعری کو بھی انگریزی میں منتقل کر کے "The Call of Trumpet" کے عنوان سے تیار کیا جو بہ قول ڈاکٹر کامران غیر مطبوعہ ہے۔ اس کے علاوہ "The Falcon and the Hunted Bird" ۱۹۵۰ء میں چھپ کر منظر عام پر آئی۔ پہلی کتاب چند تبدیلیوں کے بعد "The Bulbul and the Rose" کے نام سے ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی۔ ان کے علاوہ انھوں نے غالبؔ کی چند منتخب تخلیقات کا انگریزی میں ترجمہ کر کے "Ghalib Selected Poems" کے عنوان سے پیش کیا۔ انھوں نے میر درد کی منتخب غزلیات، رباعی، مخمس اور ترکیب بند کے بعض نمونوں کو انگریزی میں ترجمہ کر کے "The Golden Tradition" کا بھی حصہ بنایا ہے۔ انھوں نے قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ بھی کر کے اس ضمن میں اپنی صلاحیتوں کا نہ صرف لوہا منوایا ہے بل کہ دین اسلام سے اپنی محبت کا اظہار بھی کیا ہے جو ان کے لیے توشۂ آخرت کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ باب پنجم "احمد علی اور مختلف اصنافِ ادب و فن" میں ڈاکٹر کامران نے احمد علی بحیثیت نقاد، شاعر اور بطور ڈرامہ نگار کے زیر بحث لا کر ان کے تخلیقی پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ جس سے ان کی شخصیت کی قوس قزح نہ صرف مکمل ہوتی ہے بل کہ اس کو دیدہ زیب رنگ بھی عطا ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر محمد کامران کا موقف ہے کہ:

> "ہر باب احمد علی کی متنوع شخصیت کی نئی جہات کو سامنے لاتا ہے۔ "انگارے" سے قران مجید کے انگریزی ترجمہ تک، احمد علی کا تخلیقی سفر بہت سے نشیب و فراز سے گزرا ہے ان کا مطالعہ دلچسپ بھی ہے اور معنویت کا حامل بھی۔ مذکورہ مقالہ صرف احمد علی کی شخصیت کے گرد نہیں

گھومتا بلکہ یلدرم اور پریم چند کے بعد "نئے ادب" کے نقطہ آغاز، ترقی پسند تحریک کے آغاز، عروج اور زوال کے اسباب کا معروضی و موضوعی تجزیہ بھی پیش کرتا ہے۔ ۱۲؎

بعض مقالات اگرچہ سندی تحقیق کے لیے لکھے جاتے ہیں جن کا مقصد مقالات سے زیادہ سند کا حصول ہوتا ہے۔ جب کہ بعض مقالات متذکرہ بالا بات سے استثنائی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں کہ جہاں محقق کے پیش نظر سند سے زیادہ اپنے مقالے کی حیثیت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر محمد کامران کا یہ مقالہ بلا شبہ اسی ذیل میں رکھنے کے قابل ہے۔ اس سے جہاں نہ صرف ممدوح کی شخصیت کے دل کش پہلو سامنے آتے ہیں وہاں مقالہ نگار کی عزت و آبرو میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر کامران کی پانچویں تخلیقی کاوش "اردو زبان و ادب کی مختصر تاریخ" ہے جو ۲۰۱۱ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ یہ کتاب بھی ماورا بکس سے منظر عام پر آئی۔ اردو زبان و ادب کی تاریخ کے تناظر میں عام قارئین قدر ضخیم کتابوں سے آشنا ہیں جو ضخیم تو ہیں ہی بل کہ کئی جلدوں پر بھی مشتمل ہیں۔ ان سب کے بر عکس یہ کتاب قدرے مختصر ہے۔ اس میں ڈاکٹر محمد کامران نے اردو ادب کی تاریخ کے تناظر میں انتہائی اہم بحثوں اور عناوین کے تحت ادبی تاریخ کا جائزہ لیا ہے جن میں "اردو کے آغاز و ارتقاء کے نظریے" شامل ہیں لیکن ایک سرسری تاثر دینے کے لیے جنھیں زیادہ دقیق معلومات جاننے کا شوق ہے وہ دوسری تواریخ سے اپنے ذوق کی تسکین کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اس میں اردو زبان عہد بہ عہد، اردو کا عربی، فارسی، پنجابی، سندھی، پشتو اور بلوچی زبانوں سے تعلق، اردو نثر کے فروغ میں فورٹ ولیم کالج کا کردار، اردو نثر کے فروغ میں تحریک علی گڑھ کی خدمات جیسے موضوعات کو زیر بحث لا کر ادب کے طالب علموں کو کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرنے کی یہ کام یاب کوشش ہے۔

انجمن پنجاب، انجمن ترقی اردو، رومانوی تحریک، ترقی پسند تحریک، حلقہ اربابِ ذوق کے علاوہ اردو افسانے نے قیامِ پاکستان کے بعد جو اہم منزل طے کی ہیں ان کا بیان بھی اس کتاب میں بڑے دل نشین اسلوب میں ملتا ہے۔ اردو افسانے میں سعادت حسن منٹو، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی اور انتظار حسین کا جو کردار بنتا ہے وہ انھوں نے نہ صرف بیان کیا ہے بل کہ ان کے غالب رجحانات کو بھی تفہیم کی راہ دکھائی ہے۔ اس طرح ادبی تاریخ ابتداء سے قیام پاکستان تک کی منازل طے کرنے کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ انھوں نے اردو ڈراما سے متعلق شائقین ادب کی معلومات میں اضافہ کر کے ڈرامے کے اہم پہلوؤں کو بھی اپنی تحریر کا موضوع بنایا ہے۔ مزید برآں انھوں نے سید امتیاز علی تاج کے رجحان ساز ڈرامہ "انار کلی" کا بھی جائزہ لیا ہے۔ شاعری کے حوالے سے انھوں نے غالبؔ، مولانا حالیؔ، علامہ اقبالؔ، حفیظ جالندھریؔ، فیض احمد فیضؔ، مجید امجدؔ، مختارؔ صدیقی اور ناصرؔ

کاظمی کی شاعری اور ان کے تخصصات کا جائزہ لیا ہے۔ اس سے جہاں محولہ بالا شعراء کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے وہاں ان کے شعری رجحانات نے شاعری میں جو تموج پیدا کیا ہے وہ بھی اس ادبی تاریخ کا ایک نمایاں پہلو ہے۔ انھوں نے مولوی عبدالحق کے مقدمہ جو "انتخاب کلام میر" کا حصہ ہے نہ صرف اس پر روشنی ڈالی ہے بل کہ ان کے خاکوں کا مجموعہ "چند ہم عصر" کی خوبیوں سے بھی پردہ اٹھایا ہے۔ اس ادبی تاریخ میں چودھری افضل حق کی "زندگی"، عبداللہ حسین کے ناول "اداس نسلیں" اور بانو قدسیہ کے "راجہ گدھ" کے فکری و فنی عناصر بھی ملتے ہیں جس سے ان شہرہ آفاق نالوں کے موضوعات کو سمجھنے میں خاطر خواہ مدد ملتی ہے۔ اس میں طنز و مزاح کے حوالے سے مشتاق یوسفی کی کتاب "خاکم بدہن" کا اسلوبیاتی مطالعہ نہ صرف ان کے اسلوب کی بنیادی باتیں واضح کرتا ہے بل کہ "فن یوسفی" جیسے موضوع کے لطیف پہلو بھی سامنے لاتا ہے۔

مجھے ایک عرصہ نسیم حجازی سے خدا واسطے کا بیر رہا ہے اور اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ انھوں نے ناول نگاری میں تاریخ نویسی کا تڑکا کیوں لگایا ہے؟ لیکن ایم اے کی تیاری کے لیے سلیبس میں شامل ناولوں کو چار وناچار پڑھتے ہوئے مجھ پر ایک حقیقت کھل گئی جس نے میری ان کے بارے میں رائے کو یکسر بدل دیا۔ نسیم حجازی نے اگرچہ اپنے ناولوں میں رومانوی عناصر کو خاطر خواہ جگہ دی ہے اس کے ساتھ انھوں نے تاریخ کے اہم حقائق کو بھی کسی نہ کسی طرح نوجوان نسل کے ذہن میں راسخ کر دیا ہے۔ اس سے نہ صرف ناول پڑھنے کا شوق بڑھتا ہے اسی بہانے تاریخ کے اہم واقعات سے بھی افراد کماحقہ آگہی حاصل کر لیتے ہیں۔ اسی طرح اگرچہ اس مختصر تاریخ پر ایک اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ یہ تاریخ مختصر ہونے کی وجہ سے مکمل نہیں ہے۔ لیکن یہ پہلو بھی مد نظر ہونا چاہیے کہ اس بہانے دورِ حاضر کی کتاب سے دور ہوتی ہوئی نسل کے افراد ادبی تاریخ کے اہم پہلوؤں سے کم وقت میں واقفیت حاصل کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ پھر اُن کا ذوق ان کی راہ نمائی کرتے ہوئے انھیں تاریخ کی ضخیم کتابوں کو قبول اور ہضم کرنے کی صلاحیت بھی پیدا کر دے گا۔ اس کتاب کے "حرفے چند" میں مصنف کا موقف نہ صرف میری متذکرہ بالا رائے کی تصدیق کرتا ہے بل کہ تائیدِ مزید کی یقین دہانی بھی کرواتا ہے کہ:

> "کلاسیکی ادب سے جدید ادب تک کے سفر میں میری کوشش رہی ہے کہ یہ کتاب نہ صرف امتحانی ضروریات کو پورا کرے بلکہ ادب کے عام قارئین کے ذوق کی تربیت کا سامان بھی بہم پہنچائے۔۔۔ اگر ان مضامین میں شامل لفظ آگہی کے سفر میں روشنی فراہم کر سکیں یا آپ کے قلب و نظر میں اردو کی محبت کا چراغ فروزاں کر سکیں تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت بارآور ہوئی۔"[۱۳]

"کلاسیکی اردو شاعری" آن لائن تنقید اور انگریزی تراجم ڈاکٹر محمد کامران کی چھٹی کتاب ہے۔ اسے بھی حسبِ سابق ماورا بکس نے ۲۰۱۵ء میں شائع کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۶۵ صفحات پر محیط ہے۔ اس کتاب کے ابتدائی دو عنوانات ترجمہ نگاری کا فن اور شعری تراجم کے مسائل اور عصر حاضر میں ادب کی تدریس پر انٹرنیٹ کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب میں کلاسیکی شعراء ولیؔ، انشا اللہ خاں انشاؔ، مصحفیؔ، میر تقی میرؔ، خواجہ میر دردؔ، رفیع سوداؔ، غالبؔ، حکیم مومن خان مومنؔ، ابراہیم ذوقؔ، بہادر شاہ ظفرؔ اور مرزا داغ دہلویؔ کی نہ صرف شاعری پر آن لائن تنقید کو موضوع بحث بنایا گیا ہے بل کہ ان شعراء کی غزلیات کے تراجم کا موازنہ کر کے یورپی اور ایسے ممالک جہاں اردو کے سمجھنے والے لوگ کم ہیں ان کے لیے آسانی فراہم کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس طرح مغربی دنیا کے افراد بھی مشرقی ممالک کے شعراء کو با آسانی سمجھنے کے قابل ہو سکیں گے۔ چوں کہ آن لائن ادبی و تنقیدی مضامین زیادہ طویل نہیں ہوتے اور نہ ہی سوشل میڈیا سے وابستہ افراد اتنے طویل پیغامات کو پڑھنے کے متحمل ہوتے ہیں لہذا سوشل میڈیا کے ادبی پیغامات وہاں کے لیے تو درست ہیں لیکن کتاب کے تناظر میں ان میں تشنگی کا احساس ملتا ہے۔ اگرچہ مصنف نے ٹائٹل میں "آن لائن تنقید اور انگریزی تراجم" کے الفاظ درج کیے ہیں جس سے بات قابل فہم ہو جاتی ہے۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔ اسی طرح ضرورت نے ہی داستان سے ناول، ناول سے افسانے، افسانے سے افسانچے اور افسانچے سے سو الفاظ کی کہانی کو جنم دیا ہے۔ اسی تسلسل کی کڑی اس کتاب کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر محمد کامران کی تخلیقی جہتیں دھنک کے رنگوں کی مانند ہیں جو نہ صرف خوب صورت بل کہ دل کش اور منفرد بھی ہیں۔ ان میں کہیں تحقیق کی جھلک ہے تو کہیں تنقید نے افسانے کے فہم میں اپنا کردار ادا کر کے ادبی چاشنی پیدا کر دی ہے۔ کہیں تخلیقیت اور ادبیت نے فصاحت و بلاغت سے قارئین کے دلوں میں جہاں اردو کی اہمیت بڑھا دی ہے وہاں ایک طبقے کو ان کی علمی و ادبی کاوشوں کا غائبانہ معتقد بھی بنا دیا ہے۔ ان کی علمی و ادبی کاوشیں اس بات کا بھرپور تقاضا کرتی ہیں کہ ان کی تخلیقی، تنقیدی اور ادبی کاوشوں کا تفصیلی جائزہ لیا جائے۔ اس سے ان کی تخلیقات کے نئے نئے امکانات بھی واضح ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ وقت بہت قریب کہ جب ادب کے اس پارکھ کی خدمات کو تاریخ ادب اردو میں خاطر خواہ جگہ دی جائے گی اور علمی و ادبی حلقوں میں اسے سراہا بھی جائے گا۔

حوالہ جات و حواشی

۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، معنی و تناظر، (لاہور: مجلس ترقی ادب، جون ۲۰۱۶ء) ص ۱۶۸

۲۔ غالبؔ، مرزا اسد اللہ خاں، دیوانِ غالبؔ (کراچی: فضلی سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، دسمبر ۱۹۹۷ء) ص ۱۶۶

۳۔ محمد کامران، ڈاکٹر، انگارے (لاہور: ماورا بکس، ۲۰۰۵ء) ص ۱۵

۴۔ ایضاً، ص ۵۷

۵۔ ایضاً، ص ۱۰۸۔۱۰۹

6. www.RafiqSandeelvi.facebook.com

۷۔ محمد کامران، ڈاکٹر، میرا من سے انتظار حسین تک (لاہور: ماورا بکس، ۲۰۰۶ء) ص ۱۱۔۱۲

۸۔ محمد کامران، ڈاکٹر، گ سے گڑیا، ج سے جاپانی (لاہور: ماورا بکس، ۲۰۱۰ء) ص ۹۔۱۰

۹۔ ایضاً، ص ۱۱

۱۰۔ ایضاً، ص ۴۴

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۳۸

۱۲۔ محمد کامران، ڈاکٹر، پروفیسر احمد علی حیات اور ادبی خدمات (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۱۰ء) ص، ۱۰۔۱۱

۱۳۔ محمد کامران، ڈاکٹر، اردو زبان و ادب کی مختصر تاریخ (لاہور: ماورا بکس، ۲۰۱۱ء) ص ۵